عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نگاری[۱]

(۲)

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

۲۔ تاریخ فخر مدبر کے بعد سلطنت دہلی کی تاریخ پر دوسری اہم کتاب حسن نظامی نیشاپوری کی مشہور تالیف "تاج المآثر" ہے۔ حسن نظامی اپنے وطن نیشاپور سے ہجرت کر کے سلطان قطب الدین ایبک کے عہد میں ہندوستان آ کر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ اُن کے اپنے قول کے مطابق اُن کے وطن میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے تھے اور اہل فضل و دانش کی قدر دانی نہیں ہو رہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے پہلے خود مختار سلطان کی علم دوستی اور عالم نوازی کا شہرہ اس قدر بڑھ رہا تھا کہ علماء و فضلاء اس کی طرف رخ کر رہے تھے۔ غرضیکہ حسن نظامی نے بھی ہندوستان میں قسمت آزمائی کے لیے رخت سفر باندھا۔ انھوں نے لاہور کی بجائے جو کہ شمال ہندوستان میں آخری غزنوی سلاطین کی تخت گاہ ہونے کی وجہ سے علم و دانش اور تجارت کا ایک عظیم مرکز بن گیا تھا دہلی کو اپنی رہائش گاہ کے لیے منتخب کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ دہلی میں ان کے قدیم دوست احباب رہتے تھے۔ دہلی کو انھوں نے ایک ابھرتا ہوا اور دولت سے بھرپور شہر پایا اپنے علم و فضل اور دانشوری کی بنا پر دہلی کے اشراف میں جلد ہی مقبول ہو گئے۔ اُن کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ دربار شاہی سے رابطہ قائم کرنے کے لیے انھیں سلطانِ وقت یعنی قطب الدین ایبک کے کارناموں پر تاریخ مرتب کرنی چاہیے۔ حسن نظامی کو ذریعہ معاش کی

---

[۱] اس مقالہ کی پہلی قسط۔ جنوری۔ مارچ ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔

تلاش تھی وہ اس کے لیے تیار ہو گئے انھوں نے عربی میں سلطان وقت کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا اس وقت تک علماء و فضلاء میں عربی زبان ہی علم و فضل اور ثقافت کی زبان تصور کی جاتی تھی اور حسن نظامی اسی زبان میں اپنے علم و فضل اور قوتِ بیان کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے دوستوں نے انھیں مشورہ دیا کہ ہندوستان میں عربی کا رواج کم سے کم ہوتا جا رہا ہے لہٰذا عربی میں ان کی تالیف سود مند نہیں ہوگی۔ اس کے برخلاف فارسی بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اور مسلم اشراف کا جو طبقہ (Intelligentia) وجود میں آرہا ہے وہ عربی سے ناواقف اور فارسی بولنے اور پڑھنے والوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا تاریخ پر پیش نظر کتاب فارسی میں لکھی جائے۔ اسی اثنا میں سلطان قطب الدین ایبک کا فرمان جاری ہوا کہ ہندوستان میں اس کی فتوحات کی تفصیل اس کے آقا کی فتوحات کے ساتھ قلم بند کی جائے۔ اس طرح حسن نظامی نے دوستوں کے مشورہ اور ان کی ترغیب پر فارسی میں تاج المآثر لکھنا شروع کیا۔ لیکن اُن کا طرزِ نگارش صنائع بدائع، عربی کے الفاظ اور جملوں اور مشکل تشبیہات اور استعاروں اور عربی فارسی شعروں کی بھرمار کی وجہ سے مشکل اور گنجلک ہے۔

دورِ حاضر کے ادیب اور اسکالرس حسن نظامی کے اسلوب بیان کو ناپسند کرتے ہیں لیکن عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان، وسط ایشیا اور ایران کے تاریخی لٹریچر کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور کے دانشوروں کے نزدیک حسن نظامی کا اسٹائل قابل تقلید اور مثالی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن نظامی سلطان قطب الدین ایبک کی عظیم اور بے پناہ شخصیت سے بے حد متاثر تھے انھوں نے سوچا کہ اس عظیم فاتح اور فیاض حکمراں کی تاریخ لکھنے کے لیے طرزِ نگارش ایسا غیر معمولی ہونا چاہیے جو اس کی عظمت سے مطابقت رکھتا ہو۔ بعد میں نظامی کے طرزِ نگارش سے متاثر ہو کر ایران اور ہندوستان کے عظیم فاتحوں اور شہنشاہوں کی تاریخ کے لیے اسی طرزِ نگارش کو پسند کیا گیا۔ اس کی ایک اچھی مثال چنگیز خاں کی فتوحات اور تاریخی کارناموں پر عطا ملک جوینی کی تالیف "تاریخ جہاں شاہ" (۱۲۶۰ء) ہے۔ خود سلطنت دہلی میں کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی[1] اور امیر خسرو دونوں کی یہی کوشش رہی کہ دہلی کے عظیم سلطان علاء الدین

---

[1] کبیر الدین نے فارسی انشا پردازی میں اپنا کمال دکھایا اور اس ضمن میں وہ ماضی اور اپنے حال کے انشا پردازوں پر سبقت لے گئے تھے۔ ضیاء الدین برنی ان کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کرتے ہیں "در عہد =

خلجی کے عہد کی تاریخ ایسی پرشکوہ اور مشکل نثر میں مرتب کریں جو کہ ممدوح کی شایانِ شان اور خود مؤلف کی قابلیت اور نثر نگاری پر غیر معمولی قدرت کی آئینہ دار ہو۔ اگرچہ کبیر الدین کی تالیف دست بردِ زمانہ کی نذر ہوگئی مگر خسرو کی خزائن الفتوح دستیاب ہے۔ اس سے ان دونوں باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں ہندوستان کے مورخین میں ابوالفضل اور عبدالحمید لاہوری نے بھی اسی طرح کا ادق اور مشکل طرزِ نگارش اختیار کیا اس لیے کہ ان کے پیشِ نظر بھی اکبر بادشاہ اور شاہجہاں جیسے عظیم فرمانرواؤں کی تاریخ لکھنی تھی۔ بہرحال حسن نظامی کے طرزِ نگارش کی تاریخی اہمیت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ اور ثقافت سے ناواقفیت کی دلیل ہوگی اگر تاج المآثر کے طرزِ نگارش کو آج کے ادبی اسلوب کی بنیاد پر پرکھا جائے۔

حسن نظامی کی تاریخ نویسی پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فخرِ مدبر کی طرح انھوں نے بھی سلطان معز الدین کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ سلطان کی بہ نسبت اس کے غلام ملک قطب الدین ایبک کی عظمت زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ نظامی تاج المآثر کو سلطان کی پرتھوی راج کے خلاف ۱۱۹۲ء کی مہم کے ذکر سے شروع کرتے ہیں اور ان جنگوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتے ہیں جو کہ سلطان معز الدین کی قیادت میں یا اُس کی غزنی کو واپسی پر قطب الدین ایبک نے ہندو راجاؤں سے لڑیں۔ ان تفاصیل کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ منہاج سراج جوزجانی نے ان کے بیان میں بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔

جہاں تک حسن نظامی کے تاریخ نویسی (Approach) کا تعلق ہے وہ سلطان قطب الدین کے احوال میں جُملہ تفصیلات کو پُرزور انداز میں بیان کرتے ہیں، زورِ قلم کے ساتھ ساتھ مواد کو بھی بڑی محنت سے اکٹھا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ۱۲۱۰ء تک یعنی سلطان قطب الدین ایبک کی وفات تک کتاب بڑی دلچسپی کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ لیکن بعد میں عبارت کا زورِ بیان مدھم پڑجاتا ہے اور ۱۲۱۷ء میں سلطان شمس الدین التتمش کے لاہور پر عارضی قبضہ[۱] کے بعد تاج المآثر اختتام پر آجاتی ہے۔ غالباً سلطان قطب الدین

= علائی مُفتحناھہای نوشتہ است وساحری زدہ، تاریخ فیروزشاہی ص ۱۳

۱۔ منہاج سراج جوزجانی کے مطابق سلطان ناصر الدین قباچہ نے لاہور پر کئی بار قبضہ کیا۔ ملاحظہ ہو =

ایبک کی ہنگامی موت اور اُس کے بعد نئی سلطنت میں طوائف الملوکی نے مؤلف کو بددل کر دیا تھا۔ وہ دہلی کے نئے سلطان التمش کے کردار سے بھی خوش نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ التمش نے اپنے آقا قطب الدین ایبک کے بیٹے اور جائز وارث آرام شاہ کو قتل کر کے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا۔[۱]

حسن نظامی اگرچہ ہندوستان میں ابتدائی مسلم فتوحات اور مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کے نظم و نسق کے بارے میں بعض دلچسپ تفصیلات فراہم کرتے ہیں لیکن وہ بنیادی طور پر ادیب تھے اور مورخ کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بے پرواہ بھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنی تالیف کو صحیح معنوں میں تاریخ کی شکل دینے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ زور بیان اور تشبیہات اور استعاروں کے استعمال کے شوق میں واقعات کو صحیح طریقہ پر ان کے پورے پس منظر کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب وہ ہندو راجاؤں کی ایبک کے دربار میں حاضری دکھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ شاہی قالین ہندوستانی راجاؤں کی سجدہ گاہ بن گیا۔[۲] قاری اگر صحیح واقعات سے بے خبر ہو تو اس سے یہی سمجھے گا کہ سلطان اس کے لیے طاقت اور اقتدار استعمال کرتا تھا۔ لیکن امر واقعہ مختلف ہے دراصل یہ سلطان کی اس دوستانہ حکمت عملی کا ایک مظہر تھا جو اُس نے ہندوستانی راجاؤں کے سلسلے میں اختیار کی تھی۔ ایک ادیب اور شاعر ہونے کی وجہ سے مصنف مبالغہ آرائی سے بھی محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔ اگر تاج المآثر کے بیانات کو من وعن مان لیا جائے تو یہ تاثر پیدا ہوگا کہ مسلم حملہ آوروں نے ہر جگہ فتح کے وقت خون کے دریا بہا دئے تھے اور کوئی

= طبقات ناصری، مرتبہ عبدالحئی حبیبی، کابل، ۱۹۶۳، جلد اول ص ۴۱۹

جب سلطان جلال الدین خوارزم شاہ ہندوستان میں داخل ہوا تو لاہور کا حاکم قباچہ کا بیٹا تھا۔ ملاحظہ ہو، شہاب الدین نسوی، سیرت جلال الدین منکرنی، فارسی ترجمہ، مرتبہ پروفیسر رمینوی، طہران ۱۹۵۶ء ص ۱۱۹

[۱] طبقات ناصری، جلد اول، ص ۴۱۸

[۲] حسن نظامی، تاج المآثر، مخطوطہ برٹش لائبریری لندن، نمبر ۷۹۲۳ ورق ۱۳۳ الف

ہندو تہِ تیغ ہونے سے نہیں بچ سکا تھا۔ اسی طرح شمالی ہندوستان میں کسی شہر اور کسی قصبہ میں کوئی مندر بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مسلمان سلاطین کی طرح اُن کے امرا کا بھی بڑا اہم تاریخی رول رہا ہے۔ بہت سے امرا دہلی سلطنت کے اولین معماروں میں سے تھے۔ ان عظیم امرا کا ذکر مختصر ہی سہی ضروری تھا لیکن حسن نظامی (اپنی تالیف میں ان امرا کے کارناموں کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ سدید الدین عوفی نے کسی قدر لباب الالباب اور جوامع الحکایات میں اور منہاج سراج جوزجانی نے طبقات ناصری میں اس کمی کا تدارک کیا ہے۔

اخیر میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ نظامی نے تاج المآثر میں قطب الدین ایبک کے پروانہ[1] اور سلطان التتمش کا ایک فرمان نقل کیا ہے۔ یہ دونوں دستاویزات علاقوں کے والی یعنی گورنروں کی تقرری سے متعلق ہیں۔ ان دونوں سے ہمیں عہد سلطنت میں گورنروں کے فرائض اور اختیارات کے علاوہ ہندوؤں کے بارے میں مرکز کی پالیسی کا بھی بخوبی علم ہوتا ہے ان دستاویزات میں رعایا پروری، امن و امان کے قیام، تاجروں کو سہولتیں بہم پہنچا کر تجارت کو فروغ دینے، مقامی ہندو خواص و عوام کو حسن سلوک سے سلطان کا مطیع بنانے اور علما و فضلا کو مالی مدد دینے پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے[2]۔ بہرحال تاج المآثر ہندوستان میں مسلم سلطنت اور مسلم فرمانرواؤں سے متعلق تاریخ کی ابتدائی کتابوں میں سے ایک ہے اس کی وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ تیسرے اہم تاریخ نگار سدید الدین محمد عوفی تھے۔ اُن کی تالیف 'جوامع الحکایات و لوامع الروایات' اپنے تنوع کے اعتبار سے فارسی ادب میں پہلے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد بھی متعدد کتابیں مرتب کیں۔ اور

---

[1] پروانہ گورنر یا والی کا تحریری حکم نامہ ہوتا تھا جبکہ سلطان یا بادشاہ کے تحریری حکم نامہ کو فرمان کہتے تھے۔ ۱۱۹۳ء میں ایبک نے کول (علی گڑھ) فتح کرنے کے بعد وہاں اپنے ساتھی یغلبک کو والی مقرر کیا تو اس کے تقرر کے سلسلے میں پروانہ بھی جاری کیا۔ اس میں گورنر کے لیے بہت سی ہدایات ہیں جن سے سلطان کی صوبائی پالیسی پر روشنی پڑتی ہے۔

[2] حسن نظامی، تاج المآثر، مخطوطہ، برٹش لائبریری، لندن، نمبر ۷۶۲۳، ایڈیشن، ورق ۵۵ ب تا ۵۶ الف، ۱۲۸ الف تا ۱۳۰ ب۔

اُن کو یہاں کے سلطان یا وزراء کے نام معنون کیا۔ اُن کے ان علمی کارناموں کا عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم ثقافت، سیاست، دینی فکر اور تاریخ پر بڑا اثر نظر آتا ہے۔ عوفی کو دینی علوم پر قدرت ہونے کے علاوہ تاریخ سے بھی دلچسپی تھی اور وہ یہاں مورخ کی حیثیت سے اہم تاریخی واقعات پیش کر سکتے تھے۔ ان کی تین تالیفات تاریخ کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے اور ایک طالب علم کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہیں۔ غالباً یہی تین کتابیں دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم ان کی تالیفات پر تبصرہ کریں، ضروری ہے کہ اُن کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ بیان کریں کیونکہ اُن کی تعلیم و تربیت، اُن کی سیاحت اور اُن کی علمی بصیرت کا ان کی تاریخ نگاری پر بڑا اثر معلوم ہوتا ہے۔

عوفی بارہویں صدی عیسوی کے اخیر میں بخارا شہر کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے اس خاندان کے افراد علم و فضل کے لیے مشہور تھے اور وہاں کی سلطنت میں اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ خاندانی روایات کے تحت عوفی کی تعلیم و تربیت بخارا ہی میں ہوئی۔ دینی اور غیر دینی علوم میں دسترس حاصل کرنے کے بعد وہ اسلامی ممالک کی سیاحت کے لیے نکل پڑے۔ تاکہ وہاں کے علماء سے مزید فیض حاصل کر سکیں۔ وہ سمرقند سے خوارزم ہوتے ہوئے غزنین پہنچے اور راستہ میں ہر علمی اور ثقافتی مرکز میں ٹھہر کر وہاں کے علماء سے ملاقات کی اور فقہ اور حدیث کا مطالعہ کیا۔ غزنین سے ایران اور عرب ممالک گئے۔ ان کی تہذیب و شائستگی اور علمی تبحر سے متاثر ہو کر ہر جگہ اہل علم اور ارباب حکومت نے ان کی مالی اعانت کی۔[1]

ہندوستان میں ان کی آمد کی تاریخ کا مسئلہ کسی قدر متنازع فیہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنی تالیف لباب الالباب میں غزنین کے زمانۂ قیام کے دوران وہاں کے شعراء اور فضلاء کے احوال میں جن تاریخوں کا ذکر کیا ہے اس سے ڈاکٹر محمد نظام الدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ

---

[1] ملاحظہ کیجئے محمد نظام الدین کا انگریزی مقالہ Introduction to the Jawami-ul-Hikayat wa-Lawami-ul-Riwayat of Sadid Uddin Mohammad Awfi, London 1920

سنہ ۱۲۱۸ء میں غزنین سے ہندوستان آکر پناہ گزیں ہوگئے۔ اس بیان کو صباح الدین عبدالرحمن[1] اور ڈاکٹر ممتاز علی خاں[2] نے من وعن مان لیا ہے۔ لیکن جوامع الحکایات میں اس طرح کی شہادت ملتی ہے کہ وہ ہندوستان میں کسی عرب ملک سے بذریعہ بحری جہاز آئے تھے اور گجرات کی مشہور بندرگاہ کھنبایت میں اترے تھے۔ اسی بحری سفر میں اُن کو قطب نما اور اس کی کارکردگی دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ کیونکہ قطب نما اور اس کی اہمیت کا علم اُن کو پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ وہ اس کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں[3]۔ یہ واقعہ اُن کے اپنے وطن پر منگولوں کے حملہ اور فتح کے بعد پیش آیا تھا کیونکہ وسط ایشیا میں منگولوں کی غارت گری کے بعد وہاں مسلم اشراف کا رہنا مشکل ہوگیا تھا اور صاحب حیثیت مسلمان جو کہ قتل عام سے بچ سکے تھے وہ ہندوستان ہجرت کر گئے تھے لہٰذا عوفی بھی سنہ ۱۲۲۲ء کے آس پاس ہندوستان آئے۔ ان کا کھنبایت میں قاضی کی حیثیت سے رہنا اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہاں پر فقہ حنفی کے ماننے والے جن کی بڑی تعداد تجارت کے سلسلے میں موجود تھی، ان کی خدمات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ عوفی خود کہتے ہیں کہ گجرات کے ہندو راجہ نے مسلم تجار کو پوری مذہبی

---

[1] صباح الدین عبدالرحمن، بزم مملوکیہ، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴، ص ۴۶ تا ۵۰

[2] انگریزی Some importent Persian writing of the thirteenth century India, Aligarh, 1970, P.96

[3] سدیدالدین محمد عوفی، جوامع الحکایات ولوامع الروایات، قسم چہارم، مخطوطہ خدابخش لائبریری، پٹنہ، ورق ۲۵۴ب (اس کے بعد کتاب کا حوالہ صرف جوامع الحکایات ہوگا)

جوامع الحکایات چار ضخیم جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ ہر جلد میں کئی کئی ابواب ہیں۔ ان میں مذہب، اخلاق، تاریخ، جغرافیہ، سیاست اور حکومت کے نظم ونسق سے متعلق تاریخی اہمیت کی روایات درج کی گئی ہیں، علاوہ ازیں مختلف سمندروں، شہروں اور ممالک کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر نظام الدین نے پہلی قسم (یعنی جلد) کو دو حصوں میں سنہ ۱۹۶۵ء اور سنہ ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔ اُن کے بعد ایران کے فضلا، امیر بانو مظاہر مصفیٰ نے کتاب کو ترتیب دیکر شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف پہلی اور تیسری جلد ہی کو شائع کر سکے اور پھر انقلاب ایران نے کام کو روک دیا۔ ہمارے پیش نظر نظام الدین مرحوم شائع کردہ جلد اول کے دونوں حصے اور ایران سے شائع شدہ جلد سوم ہے۔ باقی مواد کے لیے خدابخش لائبریری پٹنہ کا مخطوطہ استعمال کیا گیا ہے۔

آزادی دے رکھی تھی اور کھنبایت میں اُن کی جامع مسجد بھی تھی۔ یہ تجار بیرونی ممالک سے تجارت میں مصروف تھے۔[۱] کھنبایت ہی میں کچھ عرصہ کے بعد اُن کے ہم وطن محمد سمرقندی اُن کے یہاں آکر مہمان ہوئے۔ عوفی نے اُن کو مطالعہ کے لیے قاضی التنوجی کی مشہور عربی کتاب "کتاب الفرج بعد الشدۃ" کا فارسی ترجمہ جس کو انھوں نے مکمل کیا تھا مطالعہ کے لیے دیا۔ محمد سمرقندی نے مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنے پاس رکھنے کے لیے اس کی نقل بھی تیار کر لی اور اس نقل کے اخیر میں ایک نوٹ لکھا جس میں عوفی کے ساتھ اپنے اُچہ کے سفر اور ناصر الدین قباچہ کی ملازمت اختیار کرنے کی تفصیل بھی دی۔[۲] یہاں یہ بتانا غیر مناسب نہ ہوگا کہ جوامع الحکایات پورے اسلامی لٹریچر میں پہلی کتاب ہے جس میں قطب نما کا ذکر آتا ہے۔

اُچہ میں آکر عوفی نے کتاب الفرج بعد الشدہ کے اپنے فارسی ترجمہ کو سلطان ناصر الدین قباچہ کے نام معنون کر کے دربار شاہی میں پیش کیا اس کی بنا پر وہ سلطان قباچہ اور اس کے علم دوست وزیر عین الملک العشری کا مقرب بارگاہ ہوگیا۔ جلد ہی وزیر کے احسانات سے متاثر ہو کر اُس نے اپنی دوسری اہم تالیف لباب الالباب کو مکمل کر کے وزیر کے نام معنون کیا۔ لباب الالباب میں قدیم فارسی شعراء سے لے کر اس کے اپنے حال تک کے شعراء کے اشعار اور کہیں کہیں ان کے حالات بھی دیے ہیں۔ اس کے بعد عوفی خود لکھتے ہیں کہ سلطان قباچہ نے اُن سے فرمائش کی کہ وہ کتاب الفرج بعد الشدۃ کی طرح فارسی میں کتاب لکھی جس میں سلطان کے اپنے زمانہ تک کے واقعات آجائیں۔ شاہی حکم کی تعمیل میں عوفی کتاب کی تکمیل میں مصروف ہو گئے لیکن ابھی کام اتمام تک نہیں پہنچا تھا کہ دہلی کے سلطان شمس الدین التتمش نے ملتان اور اچہ پر حملہ کر دیا۔ کئی مہینوں کی جنگ کے بعد ناصر الدین قباچہ کو شکست ہوئی اور وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ۱۲۲۸ء میں التتمش کا ملتان اور سندھ پر قبضہ ہوگیا۔ اب عوفی التتمش کے وزیر نظام الملک جنیدی کی سرپرستی میں آکر دہلی میں مقیم ہو گئے۔ یہیں انھوں نے نظام الملک کی ہمت افزائی پر ۱۲۳۱ء میں جوامع الحکایات

---

[۱] جوامع الحکایات، جلد اول حصہ دوم، صفحہ ۳۰۴ تا ۳۰۵

[۲] محمد سمرقندی کا نوٹ عوفی کے کتاب الفرج بعد الشدہ کے فارسی ترجمہ کے اخیر میں ملتا ہے جس کا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن کی لائبریری کی ملکیت ہے۔

کو مکمل کر کے اپنے نئے مربّی کے نام معنون کیا۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ جوامع الحکایات کی چاروں جلدوں میں متعدد ابواب ہیں جن کا تعلق مذہب اور اخلاق کے علاوہ مسلم سلاطین، مختلف ممالک کی جغرافیائی خصوصیات اور شاہراہوں وغیرہ سے ہے اس کے لیے قدیم عربی کتابوں اور بارہویں صدی کی فارسی کتابوں کو بنیاد بنایا گیا ہے لیکن اکثر و بیشتر مولف کے ذاتی مشاہدات اور معلومات نے ان میں خاصا اضافہ کیا ہے۔ بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں وسط ایشیا اور ہندوستان کے حالات جاننے کے لیے یہ ہمارا بہت اہم ماخذ ہے۔ بہت سا فارسی اور عربی لٹریچر جو کہ عوفی کو دستیاب تھا وہ دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا ہے۔

حسن سجزی اور ضیاء الدین برنی کی تحریروں میں جوامع الحکایات کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے شائع ہوتے ہی اس کو دہلی اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ ہر علمی ذوق رکھنے والا، خواہ وہ علماء دین اور صوفیا کے حلقہ سے ہو یا سیاست اور حکومت سے متعلق، جوامع الحکایات کا مطالعہ سود مند سمجھتا تھا۔ نبی کریمؐ اور صحابہ کے اقوال کے علاوہ پہلی جلد کا تیسرا باب اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیاء سے متعلق ہے اور اس میں شیخ علی ہجویری کی کشف المحجوب سے زیادہ تفصیلات ملتی ہیں لہٰذا عوفی کا یہ شاہکار صوفیاء کے لیے بھی دلچسپی کا باعث تھا۔ اس میں انھوں نے قدیم صوفیاء سے متعلق روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بہت سے صوفیاء اپنے فقر کے باوجود کتاب کو حاصل کرنے اور ملکیت میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ شیخ نظام الدین اولیاء کے قول سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دن شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا کہ شیخ نجیب الدین متوکل (یعنی چھوٹے بھائی اور شیخ فرید الدین گنج شکر کے خلیفہ) کو خواہش رہتی تھی کہ جوامع الحکایات کو حاصل کریں لیکن اُن کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ وہ اس کو خرید سکیں۔ اگر کبھی کاغذ خریدنے کے لیے پیسے ہوتے تو کاتب کو اجرت ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن کاتب حمید جو کہ اُن سے عقیدت رکھتے تھے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ شیخ ان کو اپنی خواہش کے ساتھ ساتھ اپنی مجبوری بھی بتائی۔ حمید نے دریافت کیا کہ اس وقت آپ کے پاس کیا رقم ہے؟ جواب دیا کہ صرف ایک درہم ہے[۱]۔ حمید نے درہم لے لیا اور اُس سے تھوڑا سا کاغذ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خرید لیا۔ ابھی یہ کاغذ ختم نہیں ہوا تھا کہ شیخ کے پاس اچھی خاصی رقم 'فتوح' کی شکل میں آگئی۔ اب پوری کتاب کے لیے کاغذ ہی نہیں بلکہ روشنائی کی قیمت اور کاتب کی اجرت بآسانی ادا ہو سکتی تھی۔[1]

ضیاء الدین برنی کے زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ کا علماء و فضلاء اور دانشوروں میں بے حد شوق بڑھ گیا تھا۔ وہ معتبر اور معیاری تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی عیسوی میں دار الملک دہلی کے واقعات لکھنے والوں میں بھی قابل احترام مورخ ہوئے ہیں۔ ان میں خواجہ نظامی (یعنی حسن نظامی) مؤلف تاج المآثر، مولانا صدر الدین (سدید الدین) عوفی، مؤلف جوامع الحکایات، قاضی صدر جہاں منہاج سراج جوزجانی، مؤلف طبقات ناصری اور کبیر الدین بن تاج الدین عراقی عظیم مورخ تھے۔ آخر الذکر نے سلطان علاء الدین خلجی (کے عہد کی تاریخ) فتحنامہا مرتب کیے اور انشا پردازی کی رو سے سحر بیانی کی۔ ان سب کی تالیفات تاریخی صداقت اور واقعہ نگاری کی وجہ سے احترام کے ساتھ دیکھی گئی ہیں، برخلاف ان کے بہت سے ناقابل اعتماد اور غیر معروف لوگوں نے سلطنت دہلی کے ابتدائی دور کی تاریخ پر کتابیں لکھیں لیکن قصہ گوئی اور حقیقت سے دوری کی وجہ سے اُن کو مقبولیت نہ حاصل ہوئی۔ وہ کتب فروشوں کی دوکانوں میں پڑی رہیں۔ بالآخر کتب فروشوں نے کاغذ صاف کرنے والوں کو دیا تاکہ دھلنے کے بعد کاغذ دوسری کتابوں میں استعمال ہو سکے۔[2]

تعجب خیز بات یہ ہے کہ ضیاء الدین برنی کے اس بیان کے باوجود دور حاضر کے مورخین کو جو کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ پر تحقیق اور تصنیف میں مصروف رہے یہ خیال نہیں آیا کہ جوامع الحکایات کو دوسری معاصر تاریخوں کی طرح دیکھیں اور ماخذ کے طور پر استعمال کریں۔ صرف روسی مستشرقین ڈبلو، بارتھولڈ نے وسط ایشیا کی تاریخ پر اس سے استفادہ کیا۔ وہ اس علمی شاہکار کی اہمیت بحیثیت تاریخ کے ایک مآخذ کے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "۱۲۲۸ء[3] میں محمد عوفی نے اپنی تالیف ہندوستان میں مکمل کی۔ مؤلف نے جوانی

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) درہم چاندی کے تنکہ کا نصف ہوتا تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں تنکہ کا ہی نام روپیہ ہو گیا تھا۔ یہ شیر شاہ کے کارناموں میں سے ایک تھا۔ [1] حسن سجزی، فوائد الفواد، لکھنؤ ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۸ [2] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، صفحہ ۱۴ [3] یہاں یہ واضح رہے کہ عوفی نے آخری واقعہ بنگال میں التمش کے خلاف بلکا خلجی کی بغاوت کو بیان کیا ہے یہ بغاوت ۱۲۳۰ء میں دبائی گئی تھی۔ لہٰذا بارتھولڈ کا بیان تصحیح طلب ہے۔

میں کافی سیر و سیاحت کی تھی اور بخارا اور سمرقند گئے تھے۔ ان کی ترتیب دی ہوئی روایات میں ہمارے لیے اہمیت وہ روایات رکھتی ہیں جو کہ قاراخانِد (ترک) خاص طور پر (سلطان) طمغاج خاں ابراہیم بن نصر (والیٔ سمرقند) سے متعلق ہیں۔ مزید برآں کتاب کے حصہ اول (یعنی جلد اول) پانچواں باب تاریخ پر ہے اور چوتھی جلد میں سولھواں باب جغرافیہ سے متعلق ہے اس میں مشرقی ایشیا کے ترک قبیلوں سے متعلق مواد اہم اور دلچسپ ہے۔ عوفی نے فارسی زبان میں سب سے پہلے بغور ترکوں پر لکھا ہے۔[1]

قبل اس کے کہ ہم اس حصہ پر تبصرہ کریں جو کہ ہندوستان میں مسلم فتح اور قیام حکومت سے متعلق ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ اُن روایات کا ذکر کریں جن کا ہندوستان میں مسلم ثقافت اور سیاست پر بہت اثر پڑا۔ مثال کے طور پر سدید الدین عوفی نے وسط ایشیا کے مسلم فرمانرواؤں کے انتظام حکومت، عدل، سخاوت، دین داری اور رفاہِ عام کے کاموں سے متعلق تاریخی اہمیت کی روایات قلم بند کی ہیں، یہ روایات گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ مسلم سلطنت دہلی کے قیام کے بعد کن اداروں اور روایات کو سلاطین اور حکمراں طبقہ نے وسط ایشیا کے زیر اثر قبول کیا اور ہندوستانی ماحول اور حالات میں اُن میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ مثلاً ہندوستان کے مسلم مورخین چودھویں صدی عیسوی سے سلاطین کے قائم کردہ سرکاری کارخانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جوامع الحکایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارخانے وسط ایشیا میں عام تھے۔ حکمراں طبقہ کے لوگوں کے علاوہ بڑے بڑے تاجر بھی کارخانے قائم کرتے تھے۔ جن میں اشیا کے بننے کے علاوہ اُن کا ذخیرہ بھی ہوتا تھا۔[2] شفاخانوں اور رفوگروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ہندوستان میں رفوگری کا آرٹ اور سرکاری دارالشفا مسلمانوں کے آنے کے بعد قائم ہو گئے تھے۔ عوفی نے غزنین کے بیمارستان (یعنی دارالشفا) کا ذکر کیا ہے۔ جس میں پاگلوں کا بھی علاج ہوتا تھا اور اُن کے وہاں رہنے کا بھی

---

[1] ملاحظہ کیجئے ڈبلو۔ بارتھولڈ Turkestan Down to the Mongol Invasion Eng. tr. Mrs. T. Minorsky and ed. C.E. Bosworth, London 1968 (edition) P. 36

[2] جوامع الحکایات۔ جلد سوم، حصہ دوم، صـ۴۶۷ تا ۴۶۸

انتظام تھا[1]

ضیاء الدین برنی نے سلطان علاء الدین کے عہد کے مارکٹ کنٹرول کو اس کا بہت اہم کارنامہ بتایا ہے[2] شیخ نصیر الدین چراغ دہلی اس کو خیر کا کام تصور کرتے تھے کیونکہ اس کی وجہ سے عوام الناس کو زندگی بسر کرنے میں آسانی ہوتی ہے[3] لیکن ان بزرگوں کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اقدام کے سلسلے میں سلطان کی رہبری کے لیے پہلے سے مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی نظیر نہ تھی لہٰذا یہ اس کا ایک انقلابی قدم تھا لیکن عوفی نے طغاج ابراہیم بن نصر کی خوبیاں اور اصلاحات بیان کرتے ہوئے اشیاء خوردنی کی قیمتوں پر اس کے کنٹرول عائد کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ چودھویں صدی میں دہلی سلطنت کے دانشوروں اور اہل حکومت کے لیے جوامع الحکایات نے ایک گائڈ یا Reference book کی صورت اختیار کر لی تھی۔

جوامع الحکایات سے ہندوستانی سلطنت کے ابتدائی عہد کے فرماں رواؤں اور وزراء اور امراء سے متعلق بھی بعض اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، جنھیں دوسرے مورخین مثلاً حسن نظامی اور منہاج سراج جوزجانی نے یا تو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر سلطان معز الدین محمد بن سام کی انصاف پسندی کو سراہتے ہوئے عوفی لکھتے ہیں کہ جب سلطان معز الدین اپنی گجرات کی مہم میں شکست کھا کر غزنین واپس آئے تو گجرات پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاریوں کے بارے میں فکر مند ہو گئے۔ اسی اثنا میں اس کے مشیروں میں سے کسی نے بتایا کہ نہروالہ (گجرات کا پایہ تخت) کے ایک ہندو تاجر سالیھن تجارتی مال غزنین بھیجتا ہے اور اس وقت اس کا لاکھوں بالوترا (چاندی کا سکہ) کی مالیت کا سامان غزنین میں موجود ہے اور یہ ترغیب بھی دی کہ سلطان اس مال کو غنیمت قرار دے کر قبضہ کر لے تاکہ فوجی تیاریاں بآسانی مکمل ہو سکیں۔ اس کے جواب میں سلطان نے کہا کہ نہروالہ کی فتح پر وہ اس مال کو وہاں چھین سکتا تھا لیکن غزنین میں اس پر ہاتھ ڈالنا غیر قانونی ہوگا اور اس

---

[1] جوامع الحکایات، جلد سوم، حصہ اول، ص ۱۲۵ [2] برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص
[3] حمید قلندر، خیر المجالس، مرتبہ خلیق احمد نظامی، بمبئی
[4] جوامع الحکایات، جلد اوّل، حصہ اول، ص ۲۸۶

طرح وہ ناانصافی کا مرتکب ہوگا۔[۱]

سلطان قطب الدین ایبک کی فیاضی، علم دوستی اور علماء نوازی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ سلطان الکریم (قطب الدین ایبک) کے عہد میں ایک مہاجر عالم جو کہ فقیہ تھا وہ ایک کنیز پر عاشق ہوگیا اور اس کے مالک کو فریب دے کر اُسے حاصل کرلیا۔ جب مالک کو کنیز کی قیمت نہیں ملی تو اُس نے قاضی کی عدالت میں استغاثہ دائر کردیا۔ واقعہ معلوم ہونے پر قاضی نے فقیہہ کو سزائے قید دی۔ جب سلطان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اُس نے کنیز کے مالک کو شاہی خزانہ سے کنیز کی قیمت ادا کرکے عالم فقہ کو رہا کرایا۔ اس کے بعد اس کو معمولی سزا دی کہ وہ شاہی محل میں سقّہ کا کام انجام دے گا۔ ایک ہفتہ تک عالم مشک کاندھے پر لے کر محل میں پانی لے جاتا رہا اس کے بعد سلطان نے اس کو معاف کرکے سرکاری ملازمت دیدی[۲] اس پالیسی کے نتیجہ میں بہت سے علماء و فضلاء بیرونی ممالک سے ہندوستان آنے لگے۔

جوامع الحکایات ہمیں سلطان التمش، اس کے امراء اور اس کے وزیر نظام الملک جنیدی کے متعلق بھی کافی مواد فراہم کرتی ہے۔ سلطان ناصر الدین قباچہ والیٔ سندھ اور ملتان اور بنگال کے خلجی حکمرانوں کے متعلق بھی اس میں بعض دلچسپ روایات ملتی ہیں۔ غرضیکہ اس کے مطالعہ سے ہمارے سامنے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت، فتوحات اور اُن کی ثقافتی روایات کے بہت سے کم تابناک گوشے زیادہ روشن ہوجاتے ہیں اور ہمیں اس دور کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۴۔ دہلی سلطنت کے چوتھے مورخ منہاج سراج جوزجانی ہیں، جن کی تالیف طبقات ناصری خاص طور پر بارھویں صدی عیسوی سے وسط ایشیا، ایران اور ہندوستان میں مسلم حکمرانی پر تاریخ کا بہت ہی اہم مآخذ ہے۔ منہاج سراج جوزجانی ۱۲۲۶ء میں منگولوں کی تاخت و تاراج سے بچ کر ہندوستان میں مہاجر کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ وہ اُچہ میں سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ اُن کے خاندان کا تعلق غور کے شاہی خاندان سے

---

[۱] جوامع الحکایات، جلد اول، حصہ دوم، صہ ۳۰۴ تا ۳۰۵

[۲] ایضاً صہ ۴۰۹ تا ۴۱۱

تھا اور اُن کی پرورش سلطان معزالدین محمد بن سام کے بھائی سلطان غیاث الدین محمد بن سام کی بیٹی کے محل میں ہوئی تھی۔[۱] سلطان قباچہ نے اُن کی بڑی عزت افزائی کی کیونکہ سلطان خود معزالدین بن سام کا غلام تھا۔ شاہی محل میں شہزادوں کے ساتھ تربیت پانے کی وجہ سے اُن میں عسکری صلاحیتیں بھی تھیں لیکن رجحان طبعیت علوم کی طرف زیادہ تھا اس لیے انھوں نے مفتی، مذکر اور فقیہہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کو ترجیح دی انھیں سیاسی امور کا بھی بخوبی تجربہ تھا جس کا اظہار جگہ بجگہ طبقات ناصری میں ہوا ہے۔ علوم دینی کے علاوہ انھیں تاریخ عالم سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ان کا تاریخی شعور بہت پختہ تھا۔ وہ اسلام میں تاریخ اور اس کی روایت سے بخوبی واقف تھے انھوں نے فارسی زبان میں اسلام اور خصوصاً مشرقی اسلامی دنیا کے ممالک کی تاریخ پر ایک نہایت معیاری تاریخی شاہکار یعنی طبقات ناصری کو ترتیب دے کر شہرتِ دوام حاصل کی۔ آج کے تنقیدی اسالیب کی روشنی میں بھی ان کی تالیف قابلِ احترام ہے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب تیرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے شروع میں مؤلف نے طبقاتِ ناصری کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو دہلی اور سلطنت دہلی میں تاریخ کا مطالعہ اور تاریخ نگاری بہت مقبول تھی۔ اس وجہ سے بہت اچھا تاریخی لٹریچر مہیا ہو چکا تھا۔ فخر مدبر، حسن نظامی، سدیدالدین عوفی کے علاوہ خواجہ شمس معین کئی جلدوں میں دہلی سلطنت میں مہاجر سیاسی مدبر، فوجی جنرل اور نائب مملکت ملک قطب الدین حسن غوری کی سوانح عمری شائع کر چکے تھے۔ اس علمی فضا میں یقیناً منہاج سراج نے سوچا ہوگا کہ وہ اپنی تالیف کو کس طرح مرتب کریں کہ وہ پہلے سے موجود تاریخ کی کتابوں سے مختلف اور امتیازی خصوصیات کی حامل ہو۔ لہٰذا انھوں نے مروجہ روش سے ہٹ کر اسلام کی تاریخ کو شروع سے لے کر اپنے زمانہ تک مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق انھوں نے اسلام کی تاریخ حضرت آدمؑ سے شروع کی ہے اور اُن تمام انبیاء کرام کا مختصر حال بیان کیا ہے جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے۔ نبی کریمؐ کی تاریخ ہجرت کے بعد سال بہ سال تاریخ وار (Chronological order) بیان کی ہے۔ اس کے بعد خلفاء کی تاریخ خلافتِ راشدہ سے آخری عباسی خلیفہ یعنی ۱۲۵۸ء تک لکھی۔ چونکہ منہاج مذہبی ذہن و مزاج کے مالک اور عالم دین تھے لہٰذا اُن کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ

---

[۱] طبقات ناصری، مرتبہ عبدالحئی حبیبی، جلد اول، کابل ۱۹۶۳، صـ۳۷۲

رسول اللہؐ یا اُن کے خلفاء سے پہلے وہ قدیم غیر مسلم ایرانی شہنشاہوں کا احوال لکھتے۔ انھوں نے قدیم ایرانی شہنشاہوں کا ذکر مسلم خلفاء کے بعد کیا ہے۔ قدیم ایران کی تاریخ لکھنے کی مسلمانوں میں روایت قائم ہو چکی تھی۔ وسط ایشیا اور ایران کے بہت سے مسلم سلاطین بھی قدیم ایرانی شہنشاہوں سے اپنا شجرہ نسب ملاتے تھے۔ مثال کے طور پر منہاج کے اپنے مربّی یعنی غور کے فرمانروا اپنے آپ کو ضحاک کی اولاد بتاتے تھے۔

طبقات ناصری کے وہی حصے اہم ہیں جو بارہویں صدی عیسوی سے وسط ایشیا، ہندوستانی اور چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں سے متعلق ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ فارسی زبان میں تمام عالم کی تاریخ پر پہلی کتاب ہے۔ دراصل یہ عالم اسلام کی بھی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ اس میں مصر اور شمالی افریقہ کے مسلم سلاطین کا ذکر نہیں ہے۔

ہندوستان سے متعلق طبقات میں منہاج ایک دیانت دار مورخ اور دانشور کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں اس کے نام معنون کرنے کے لیے لکھ رہے تھے۔ اس میں التمش کے اُن اقدامات کا ذکر کرنا جن کا شریعت اسلامی میں کوئی جواز نہیں ہے لیکن ایک ایمان دار مسلم مورخ کی حیثیت سے انھوں نے ضروری سمجھا کہ آنے والی نسلوں کے علم میں یہ بات رہے کہ التمش نے ان مسلم امراء کو دھوکا سے اور بہیمانہ طریقہ سے قتل کیا تھا جن کے وجود کو وہ اپنے لیے خطرناک تصور کرتا یا ان کو اپنا رقیب تصور کرتا تھا اس مشکل فرض کی ادائیگی کے لیے انھوں نے اشاروں اور کنایوں سے کام لیا ہے اور کہیں کہیں سلطان التمش کی تعریف میں بھی دبی پردہ تنقید کی ہے۔

غالباً منہاج کے اسی طرز نگارش سے متاثر ہو کر عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سب سے عظیم مورخ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ اگر مورخ سلطان وقت پر تنقید کو خلاف مصلحت سمجھتا ہے اور تنقید سے اس کو سلطان کا خوف باز رکھتا ہے تو اُس کا فرض ہے کہ حقائق کو اشارہ اور کنایہ کے ذریعہ واضح کر دے[1]۔ برنی نے یقیناً یہ بات منہاج کے ہاں پائی تھی کہ وہ التمش کے ہم عصر بنگال اور ملتان کے سلاطین کی تعریف کرتے ہیں ملتان اور سندھ کے سلطان قباچہ سے منہاج ذاتی طور پر متاثر تھے جبکہ بنگال کے خلجی فرماں روا سلطان غیاث الدین

---

[1] تاریخ فیروز شاہی، صد ۱۵-۱۶

عیوض خلجی کے دینی اور رفاہ عام سے متعلق کارناموں کے بارے میں انھوں نے لکھنوتی میں اپنے زمانۂ قیام کے دوران معتبر لوگوں سے واقعات سنے تھے۔ علاوہ ازیں اُس نے بنگال میں خود بھی دیکھا تھا کہ خلجی حکمراں نے رعیت کی سہولت کے لیے نہریں، پُل اور شاہراہیں تعمیر کرائی تھیں اور بیرونی علماء کو بلا کر مدرسے کھولے تھے لیکن دونوں ہی سلطانوں کو التمش نے جارحیت سے ختم کر دیا تھا۔ پھر التمش کی تعریف میں لکھتے ہوئے اس واقعہ کو بڑی خوش اسلوبی سے واضح کر دیتے ہیں کہ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد دہلی میں امراء کی سازش پر التمش براؤں سے جہاں وہ والی یعنی گورنر تھا پوشیدہ طریقہ سے آیا اور کچھ دنوں کے بعد اپنے آقا سلطان قطب الدین کے بیٹے اور جانشین آرام شاہ کو ختم کر کے تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اپنی حکومت کے لیے قانونی جواز پیدا کرنے کے لیے اپنے آقا کی بیٹی سے شادی کرلی اس سے پہلے وہ ناصر الدین قباچہ کے متعلق بیان کر چکے تھے کہ قباچہ سے تعلق قائم کرنے کے لیے ایبک نے اس سے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کی تھی اور اُس کے مرنے کے بعد اپنا تعلق برقرار رکھنے کے لیے دوسری بیٹی کا نکاح کر دیا تھا۔ بڑی بیٹی سے قباچہ کے ایک بیٹا تھا جس کا نام اور لقب علاء الدین بہرام شاہ تھا۔ ایبک کا نواسہ ہونے کی بنا پر اس کا بڑا وقار تھا۔[1]

یہی نہیں بلکہ بہت سے دولت مند امراء جن کے وجود سے سلطان التمش اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خطرہ محسوس کرتا تھا اُن کو اُس نے مختلف طریقوں سے ختم کرا دیا تھا۔ اس واقعہ کو ایک خدا ترس مسلمان امیر کے احوال میں اس کی دین داری کی تعریف کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتے ہیں: (ملک سیف الدین ایبک) سلطان التمش کا غلام تھا اور اُس کی سر جاندار (شاہی گارڈس کا افسر اعلیٰ) کی حیثیت سے چار لاکھ جیتل سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ جب سلطان کو اطلاع دی گئی کہ وہ شاہی خزانہ سے تنخواہ کی ادائیگی کے وقت ملول نظر آتا ہے جیسا کہ اس کے اندر کراہیت ہو۔ سلطان نے اس سے اس کا سبب پوچھا۔ اُس نے عرض کیا کہ مجھے مسلمانوں کو مارنے کے بعد اُن کے بچوں کو اُن کے ترکہ سے محروم کرنے کا کام سپرد کیا گیا ہے اگر کوئی دوسرا کام مل جائے تو عنایت ہوگی، سلطان نے اس پر کرم کیا اور اس کو اقطاع نارنول دے دیا۔[2]

---

[1] طبقات ناصری، جلد اول، صہ ۴۲۰

[2] ایضاً جلد دوم، کابل ۱۹۶۴، صہ ۲۲۰

سلطان التمش کے بعد اس کے جانشینوں میں سلطان رضیہ بنت التمش کے عہد کی تاریخ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس زمانہ کے علماء و فضلاء عورت کی سیاسی قیادت کے خلاف تھے[1] لیکن منہاج عورت کی سیاسی قیادت کو مانتے ہیں بشرطیکہ اس میں ضروری صلاحیت پائی جاتی ہو۔ وہ سلطان رضیہ کو عظیم خاتون بتانے کے علاوہ کہتے ہیں کہ التمش کے بعد اس میں تمام وہ اچھی خوبیاں بدرجہ اتم تھیں جو کہ ایک فرماں روا میں ہونی چاہئیں۔ مثال کے طور پر وہ اس کو عادل، کریم، عالم نواز، عدل گستر، رعیت پرور اور لشکر شکن بتاتے ہیں اور اس کے زوال کی ذمہ داری ان ترک امراء پر عائد کرتے ہیں جو کہ اس کے مخالف تھے۔ بہرحال طبقات ناصری مسلمانوں کی تاریخ پر موجود لٹریچر میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ منہاج کی قائم کردہ روایات کو چودھویں صدی عیسوی میں برنی نے آگے بڑھایا۔

---

[1] اس کی بنیاد اصلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس کی باگ ڈور عورت کے ہاتھ میں ہو۔ (جلال الدین)

ادارۂ تحقیق سے آپ حسب ذیل کتابیں بھی طلب کر سکتے ہیں

معروف و منکر	مولانا سید جلال الدین عمری ۳۵/-	خطبات یورپ	مولانا مودودیؒ ۱۶/-
خدا اور رسول کا تصور۔ اسلامی تعلیمات میں	" ۳۵/-	تحریک اور کارکن	" ۱۸/-
عورت اسلامی معاشرہ میں	" ۲۵/-	فکری تربیت کے اہم تقاضے	یوسف قرضاوی ۱۸/-
اسلام کا تصور مساوات	مولانا سلطان احمد اصلاحی ۲۰/-	مترجم: سلطان احمد اصلاحی	
انسانی معاشرہ اسلام کے سائے میں	" ۲۰/-	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مولانا مسعود عالم ندویؒ ۸/-
اسلامی تصوف	مولانا سید احمد عروج قادری ۱۸/-	سوشلزم یا اسلام	خورشید احمد ۱۲/-
آداب زندگی	مولانا محمد یوسف اصلاحی ۳۵/-	مسئلہ قومیت	مولانا مودودیؒ ۹/-
معرکۂ فرعون و کلیم	مولانا اخلاق حسین قاسمی ۹/-	غیر سودی بنک کاری	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی
زنداں کے شب و روز	زینب غزالی ۲۵/-	فن تعلیم و تربیت	افضل حسین ۲۲

مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ